باسمہٖ تعالیٰ

ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

(بتقریبِ "عیدالفطر" ۱۹۸۳ء)

عزیزانِ گرامی قدر! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

میں اس (آنے والی) عید کے تصور میں گم، حال کے دریچوں سے ماضی کے تناظر کو جھانک رہا تھا کہ میرے سامنے ایک خطاب آیا جسے میں نے (عنوانِ بالا سے) آج سے چودہ سال پہلے (۱۹۶۸ء کی عید پر) پیش کیا تھا۔ میں نے حالات پر غور کیا تو دیکھا کہ شامِ عید کی تیرگی پر میں نے جو خون کے آنسو بہائے تھے اس پندرہ سال کے عرصہ میں ان میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں۔ اُس وقت اگر ہلالِ عید ہمارے حال پر ہنستا تھا تو آج وہ قہقہے لگاتا ہے۔ اور اگر حقیقتوں پر پڑے ہوئے پردوں کو کچھ اور اُوپر اٹھایا جائے تو نظر آجائے گا کہ یہ پندرہ سال کی بات نہیں۔ قوم کے دھڑکتے ہوئے دل، علامہ اقبالؒ نے یہ بات آج سے پچھتر سال پہلے کہی تھی۔ اُس وقت سے اِس وقت تک کے حالات کا اگر آپ، بہ نگاہِ تعمق جائزہ لیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ ہماری ہر عید سابقہ عید کے مقابلہ میں زیادہ غم آلود ہوتی چلی گئی۔ جس قوم کی یہ حالت ہو اس کی حرماں نصیبی کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

اُس کے دل سے پوچھئے، اُس کے جگر سے پوچھئے۔ آج جس کی منزلِ مقصود کل سے دور ہو۔

کہا جائیگا کہ خوشی کے موقعہ پر غم کی داستانیں کچھ اچھی نہیں لگتیں۔ درست اور بجا؟ لیکن میرے قلبِ حساس کی فغاں یہ ہے کہ تصنع کی ہنسی حقیقی آنسوؤں سے کہیں زیادہ کرب انگیز ہوتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی فنکارانہ شعار اختیار نہیں کیا کہ جگر میں ٹیس، لب ہنسنے پہ مجبور۔ لہٰذا مجھے، اس داستانِ غم کے دہرانے کی اجازت دیجئے، ویسے بھی

مرا رونا نہیں، رونا یہ ہے سارے گلستاں کا

میں پندرہ سال پہلے کے نوحۂ غم کو مناسب، ترمیمات کے ساتھ پیش کرنے کی معذرت چاہتا ہوں۔

بنیادی طور پر لفظ عید کے معنی ہیں بار بار لوٹ کر آنے والا واقعہ، لیکن اصطلاحاً اس سے مراد ہے وہ جشنِ مسرت

جو بار بار آئے۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ صرف ایک جگہ آیا ہے، اور وہ ہے وہ مقام جہاں حضرت عیسیٰؑ کے جانثار حواریوں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ خدا سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمارے لئے "مائدۃ من السماء" اتارے تاکہ اس سے ہماری جسمانی پرورش کے علاوہ ہمارے قلوب کو بھی اطمینان حاصل ہو۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ نے خدا سے درخواست کی کہ رَبَّنَآ اَنۡزِلۡ عَلَيۡنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوۡنُ لَنَا عِيۡدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنۡكَ‌ۚ وَارۡزُقۡنَا وَاَنۡتَ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ (۵/۱۱۲-۱۱۴) "اے ہمارے پروردگار! ہماری نشوونما کا سامان "آسمان" سے عطا فرما تاکہ وہ رزق، اس جماعت کے السابقون الاولون کے لئے بھی موجب جشنِ مسرت ہو اور ان کے بعد آنے والوں کے لئے بھی — تو بہترین رزق عطا کرنے والا ہے۔" سوال یہ ہے کہ یہ مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ آسمان سے اُترنے والا رزق — کیا تھا جس کی درخواست خدا سے کی گئی تھی اور جو ان سب کے لئے باعثِ جشنِ مسرت تھا۔ اعجوبہ پسندوں نے تو حسبِ معمول، اسے بھی ایک چیستان بنا دیا اور کہا کہ حواریوں کے لئے آسمان سے پکے پکائے کھانوں کا طشت اُترا کرتا تھا۔ حتّٰی کہ اس میں جو کھانے اُترتے تھے اُن کی تفاصیل تک بھی دی جانے لگ گئے۔ لیکن جن کی نگاہیں قرآنی حقائق پر ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جماعتِ مومنین جب "آسمان سے رزق" طلب کرتی ہے تو اس سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے۔

آسمان سے رزق

ایک رزق وہ ہے جو انسانوں کے خود ساختہ نظام کی رُو سے ملتا ہے۔ یہ وہ رزق ہے جس سے جسم تو زندہ رہتا ہے لیکن شرفِ انسانیت کی موت واقعہ ہو جاتی ہے۔ اور دوسرا رزق وہ ہے جس سے جسمِ انسانی کی نشوونما کے ساتھ، شرف و تکریمِ انسانیت کی بھی بالیدگی ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

ایں خدا نانے دہد جانے بُرد
آں خدا نانے دہد جانے دہد

یہی وہ سماوی اقدار کے مطابق ملنے والا رزق تھا جس کے متعلق حواریوں نے کہا تھا کہ اَنۡ نَّاۡكُلَ مِنۡهَا وَتَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُنَا۔ وہ ہمارے لئے وجہ زیست بھی ہو اور باعثِ اطمینانِ قلب بھی۔ مومن کے لئے باعثِ مسرت وہی رزق ہو سکتا ہے جس سے اطمینانِ قلب بھی حاصل ہو — اور ظاہر ہے کہ مومن کو اطمینانِ قلب اسی زندگی میں حاصل ہو سکتا ہے جو قوانینِ خداوندی کے مطابق بسر ہو — اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ (۱۳/۲۸) یہی تھا وہ رزق جسے 'اٰيَةً مِّنۡكَ' (۵/۱۱۴) کہا گیا تھا۔ یعنی خدا کے نظامِ ربوبیت کی صداقت کی نشانی اور اس کے خیر الرازقین ہونے کا ثبوت — یعنی وہ رزق جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا محتاج ہو، نہ محکوم۔ جس میں عزت اور غیرت بیچ کر روٹی کا ٹکڑہ حاصل نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

یہ رزق انہیں ملا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ یاد رکھو۔ فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بَعۡدُ مِنۡكُمۡ فَاِنِّىۡۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ۔ (۵/۱۱۵) جو اس نظامِ رزق سے انکار اور سرکشی کی روش اختیار کریگا اس پر ایسا عذاب وارد ہوگا جس کی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

اس سے کفران کا نتیجہ

یہی وہ عذاب ہے جسے سورۂ نحل میں ایک مثال کے ذریعے یوں سامنے لایا گیا ہے کہ:

> خدا ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے اس کے رہنے والوں کو امن بھی حاصل تھا اور اطمینان بھی۔ اس کی طرف چاروں طرف سے رزق فراوانیوں سے کھنچے چلا آتا تھا لیکن انہوں نے ان انعامات خداوندی سے کفر برتا اور نظامِ خداوندی کی جگہ اپنا خود ساختہ نظام اختیار کر لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خوف اور بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ (۱۶/۱۱۲)

یہ انسانیت کی بڑی محرومی اور بدنصیبی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے مقدس ساتھیوں کی اصلی تصویر یا تو اُن کے نام لیواؤں کی عقیدت کی شمعوں کے دھوئیں سے ڈھپ چکی ہے اور یا اسے افسانہ طرازیوں کے پردوں میں چھپا دیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ حقیقت دنیا کے سامنے آ ہی نہیں سکی کہ وہ کیسے عظیم انقلاب کے پیامبر تھے اور انہوں نے کس طرح یہودی پیشوائیت کے خود ساختہ نظام ہیکل اور رومیوں کے قصرِ حکومت کی بنیادوں تک کو ہلا دیا تھا۔ اگر ان کی صحیح تاریخ سامنے آ جاتی تو معلوم ہو جاتا کہ انہوں نے کس قسم کا آسمانی نظامِ معیشت قائم کیا تھا جس سے انہیں انسانوں کا مرہونِ منت ہوئے بغیر سامانِ زیست میسر آتا اور ان کے لئے وجہ جشنِ عید بنتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود محرف انجیل میں بھی اس قسم کے اشارات ملتے ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو معاشی نظام انہوں نے قائم کیا تھا اس کے نمایاں خط و خال کیسے تھے۔ اس سے نظر آتا ہے کہ اس جماعت کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان میں

انقلاب عیسوی

کوئی شے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی تھی۔ تمام سامانِ زیست مشترکہ استعمال کے لئے کھلا رکھا جاتا تھا۔ کسی کے پاس کوئی شے اس کی ضرورت سے زائد نہ تھی۔ "رسولوں کے اعمال" میں ہے:

> وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے اور اپنی جائداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ (سب مل کر) خوشی اور سادہ دلی سے کھانا کھایا کرتے تھے اور خدا کی حمد کرتے اور سب لوگوں کو عزیز رکھتے تھے۔

(رسولوں کے اعمال ۲/۲۱-۴۷)

یہ تھا وہ نظامِ رزق جسے انہوں نے مائدۃ من السماء (سماوی اقدار کے مطابق رزق) کہہ کر پکارا تھا اور جس کے ملنے پر جشنِ عید منایا گیا تھا۔

قرآن کریم بتاتا ہے کہ الدین شروع سے آخر تک ایک ہی چلا آیا ہے۔ مختلف رسولوں کے زمانے میں، اس دین پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقوں میں فرق ہوتا تھا لیکن دین کی اصل وہی رہتی تھی۔ اس لئے، جس اندازِ زیست کی طرف، حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے حوالے سے اشارہ کیا گیا ہے وہ انہی کی خصوصیت نہیں تھی۔ اصولی طور پر خدا کا ہر رسول اسی قسم کا انقلابی نظام قائم کرنے کے لئے آتا تھا جس میں "تیری اور میری" کا جھگڑا نہ رہے اور جو کچھ جماعت (یا اُمت) کے پاس ہو وہ سب کے لئے مشترکہ متاعِ زیست ہو۔ بنا بریں، جو نظام محمد رسول اللہ

والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں قائم ہوا تھا اس کی بنیادی خصوصیت بھی یہی تھی۔ کیا آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی اس روایت پر غور نہیں کیا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ "قبیلۂ اشعر کے ہاں یہ دستور تھا کہ جنگ کے زمانے میں، یا ویسے ہی جب ضرورت کا تقاضا ہوتا، قبیلے کے تمام افراد، سارا سامانِ رزق ایک جگہ جمع کر لیتے اور اس میں سے ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے مطابق لے لیتا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس اعتبار سے میں بھی قبیلہ اشعر میں سے ہوں"۔ یہی تھا وہ آسمانی انقلاب جسے برپا کرنے کے لئے حضورؐ نے اپنی دعوت کو پیش کیا تھا۔ قریش کے تاجروں،

رسولؐ اللہ کی دعوت کی مخالفت

مہاجنوں اور کعبہ کے مجاوروں کی طرف سے جو اس دعوت کی اس قدر شدید مخالفت ہوئی تھی تو اس لئے نہیں کہ اس میں ایک خدا کو الٰہ تسلیم کرنے کی تعلیم تھی۔ اس سے اُن کا کیا بگڑتا تھا؟ یہ مخالفت اس لئے تھی کہ اس میں وحدتِ خالق کے ایمان کا فطری نتیجہ وحدتِ انسانیت کا نظریہ تھا۔ اس سے مساواتِ انسانیہ کا اصول سامنے آتا تھا جس کی رو سے مختلف افراد میں کسی قسم کی تفریق باقی نہیں رہتی تھی۔ "اللہ ایک ہے" کے عقیدہ سے انہیں کسی قسم کی پرخاش نہیں تھی انہیں مخاصمت تھی اس نظریہ سے کہ تمام انسان ایک جیسے ہیں۔ اور "تمام انسان ایک جیسے ہیں" کے نظریہ کا اوّلین عملی نتیجہ یہ تھا کہ سامانِ زیست میں تمام افراد یکساں طور پر شریک ہیں۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کے سرچشموں پر . . . . سانپ بن کر بیٹھ جائے کہ دوسرے انسان اپنی روٹی تک کے لئے اس کے دستِ نگر اور محتاج ہو جائیں۔ ابوجہل نے غلافِ کعبہ کو تھام کر اپنے خداؤں سے جو فریاد کی تھی وہ یہی تھی کہ اس نئے دین لانے والے کی قیامت خیزیوں کو دیکھو کہ

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلمانؓ مزدکی است

یہ تھا وہ نظام جسے ہر رسول پیش کرتا تھا اور جس کی مخالفت اس کی قوم کے سرمایہ دار طبقے کی طرف سے ہوتی تھی۔ قومِ مدین نے حضرت شعیبؑ کے نماز پڑھنے کے خلاف اعتراض نہیں کیا تھا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ صلوٰۃ، انہیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنا مال بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکیں! آپ نے غور فرمایا کہ نظامِ خداوندی میں صلوٰۃ کا دائرہ کس قدر وسیع ہوتا ہے؟ یہ نظام (خداوندی) دولت پر اپنا کنٹرول اس لئے رکھتا ہے کہ اس سے مساواتِ انسانیہ قائم رہتی ہے۔ مساوات کے سلسلہ میں آپ غور کیجئے کہ محل میں پیدا ہونے والا اور جھونپڑی میں جنم لینے والا بچہ، دونوں، ایک جیسی حالت میں پیدا ہوتے ہیں۔ محل میں پیدا ہونے والا بچہ نہ اپنی پیٹھ پر سونے اور چاندی کی تھیلیاں

مساواتِ انسانیہ کا اصول

لاد کر لاتا ہے اور نہ ہی اس کے ہاتھ میں کوئی خداوندی دستاویز ہوتی ہے کہ ہم نے اُسے اتنے مربعے اراضی یا اتنے کارخانوں کا مالک بنا دیا ہے۔ دونوں بچے خالی ہاتھ پیدا ہوتے ہیں۔ پھر دونوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ یعنی جن اشیاء پر ان کی زندگی کا مدار ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ ہے مساواتِ انسانیہ کی بنیاد۔ لیکن انسانوں کا خود ساختہ غلط نظام، ان میں تفریق پیدا کر دیتا ہے۔ ایسی تفریق کہ ایک انسان کے بچوں کو اتنا بھی میسر نہیں ہوتا

جتنا دوسرے انسان کے کتوں کو ملتا ہے۔ دینِ خداوندی اس تفریق کو مٹا کر مساواتِ انسانیہ قائم کرنے کے لئے آتا ہے اور خدا کا رسول اس نظام کو عملاً متشکل کر کے دکھاتا ہے۔

روٹی کی اہمیت

اس میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی کا مدار صرف "روٹی" (بنیادی ضروریات زندگی) پر نہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ زندگی کی موجودہ سطح پر، انسان کی طبیعی زندگی کا مدار روٹی ہی پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظامِ خداوندی میں روٹی کو اس قدر اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جب دنیا میں خدا کے پہلے گھر کی بنیاد رکھتے ہیں ــــ یعنی توحید کا اولین مرکز قائم کرتے ہیں ــــ تو اس کے بعد سب سے پہلی آرزو جو دعا بن کر ان کے لبوں تک آتی ہے، یہی تھی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (۲/۱۲۶) "اے میرے نشوونما دینے والے! تو اس بستی کو پُرامن بنا دے اور اس کے رہنے والوں کو ہر طرح کا رزق مہیا کر دے"۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں، رزقِ فراواں کو خدا کا انعام، اور بھوک کو اس کا عذاب قرار دیا گیا ہے۔ اس نے بنی آدم سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ــــ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی ــــ وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴) اور جس کی یہاں روزی تنگ ہو گی اسے قیامت کے دن بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا کہ ــــ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ (۷/۴۰) "ان پر آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے"۔ یہی تھا خدائے جلیل کا وہ اعلانِ عظیم جس کی تشریح میں نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا۔ کہ "جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی اس طرح صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، خدا نے اس بستی سے اپنی حفاظت کا ذمہ اٹھا لیا"۔ یہ کیا ہے؟ وہ عدمِ مساواتِ انسانیہ جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اگر اس بستی پر کوئی آفت آ گئی تھی (اور ایسا بعض اوقات ہنگامی حالات میں ہو جاتا ہے) تو اس کے تمام باشندوں کو بھوکا رہنا چاہیئے تھا لیکن ایسا نظام جس میں بستی کے چند افراد تو پیٹ بھر کر کھا لیں لیکن دیگر افراد بھوکے رات کاٹیں، یہ اسلامی نظام نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے اس بستی پر خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔ خدا تو اس نظام کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے جو اس کے قوانین کے مطابق متشکل ہو۔ وہ نظریۂ زندگی، وہ نظامِ حیات، وہ تہذیب، وہ تمدن کبھی باقی نہیں رہ سکتا جس میں انسان اور انسان میں فرق کیا جائے، جس میں طبقاتی تقسیم ہو۔ فلاح اور بقا اسی نظریہ، اسی نظام، اسی تمدن کیلئے ہے جو بلا تفریق تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں باعثِ منفعت ہو۔ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) حقیقت یہ ہے کہ بھوکے آدمی کے لئے تمدنی ترقی کا کوئی شعبہ بھی وجۂ کشش اور باعثِ طمانیت و تسکین نہیں ہو سکتا ــــ کسی بھوکے آدمی کو جناح باغ لے جا کر بہار کی رنگینیاں اور کیف آفرینیاں دکھایئے، وہ انہیں کبھی (APPRECIATE) نہیں کر سکے گا۔ اسے بتایئے کہ ملک میں بجلی اس قدر عام ہو گئی ہے

ملک کی ترقی کا معیار

کہ گھر گھر قمقمے جل رہے ہیں۔ سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے۔ سربفلک عمارات کھڑی ہو گئی ہیں۔ بڑے بڑے گرانڈیل کارخانے مصروفِ گردش ہیں۔ فضا میں طیارے پرفشاں ہیں۔ زمین پر موٹریں محوِ خرام ہیں۔ وہ یہ سُن کر کہے گا کہ یہ سب ٹھیک ہے لیکن ــــ میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی ــــ بھوک میں بہار کی نزہت آفرینیوں اور بجلی کے قمقموں کی نور افشانیوں سے لطف اندوز

ہوتا تو ایک طرف، سعدیؔ کے الفاظ میں، بھوکے کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب وہ رات کو نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس سوچ میں غرق ہوتا ہے کہ — چہ خورد بامداد فرزندم — صبح میرے بچوں کو روٹی کہاں سے ملے گی اس سے بھی آگے بڑھیئے! جاہلیہ عرب میں قبیلہ بنوحنیفہ نے آٹے کا ایک بُت بنا رکھا تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ لیکن جب قحط پڑا تو وہ اپنے اس "خدا" کو بھی کھا گئے۔ اور ایک قبیلہ بنوحنیفہ ہی پر کیا منحصر ہے! ہر بھوکا اس "خدا" کو کھا جاتا ہے جو اسے روٹی نہیں دیتا۔ روس کے انقلابیوں نے اسی طرح اس "خدا" کو کھا لیا تھا جس کے متعلق انہیں بتایا گیا تھا کہ ان کی مفلسی اور مفلوک الحالی کا ذمہ دار وہی ہے — لہٰذا جس شخص کے پیٹ میں روٹی نہیں، جس کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں، جسے سر چھپانے کے لئے چھت میسّر نہیں، جس کے پاس دم توڑنے والے بچّے کے حلق میں ٹپکانے کے لیئے دودھ کے چار قطرے نہیں، اس کے لئے دنیا کی کوئی جاذبیت وجۂ سکون اور باعثِ دلکشی نہیں ہو سکتی۔ جس شخص کے پاس اپنے بچّے کے داخلے کے لئے پیسے نہیں، اس کے لئے یہ خوشخبری کسطرح وجۂ طمانیت ہو سکتی ہے کہ ملک میں دس ہزار اسکول کھُل گئے ہیں اور دو ہزار کالج قائم ہو گئے ہیں۔ قوم کی ترقی کا معیار ایک اور فقط ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ اس میں ہر ایک فرد کو کیا میسّر آتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس میں چند انسانوں کو کیا کچھ حاصل ہو گیا ہے اور حاصل ہو رہا ہے — جنّت کی تو بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس میں جس قدر سامانِ آسائش و آرائش ہے، ہر ایک کے لئے یکساں ہے۔ جس جنّت میں مساواتِ انسانیہ نہیں، وہ جنّت نہیں جہنّم ہے۔

لیکن اس قسم کی عملی مساواتِ انسانیہ تو اسی صورت میں قائم ہو سکتی ہے جب رزق کے سرچشمے خدا کی ملکیت میں رہیں۔ افراد کی ملکیت میں نہ چلے جائیں۔ جنّت کے متعلق یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اس کی زمین، اس کے چشمے اس کی نہریں، اس کے باغات، افراد کی ملکیت ہوں گے کہ جس کا جی چاہے اپنے قطعۂ اراضی کو پٹہ پر دیدے اور جس کا جی چاہے، اسے گروی رکھ دے یا فروخت کر دے۔ توحید کا عملی مفہوم ہی یہ ہے کہ سارے سلسلۂ کائنات کا واحد

صرف خدا کی ملکیّت

مالک خدا ہے۔ اگر اس کی ملکیّت میں کسی اور شامل کر لیا جائے تو یہ شرک ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآن اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کہہ کر پکارتا ہے (۲/۲۲)۔ جب رزق کے سرچشموں پر انفرادی ملکیت تسلیم کر لی جائے تو جن لوگوں کی اپنی ملکیت نہ ہو، وہ ان مالکوں کے محتاج اور دست نگر ہو جاتے ہیں۔ اور محتاجی کا اگلا قدم — یا یوں کہیئے کہ فطری نتیجہ — محکومی ہے۔ قرآن، اس تصوّر کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو جب وہ کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا — تم خدا کو چھوڑ کر جن کی محکومی اختیار کرتے ہو، جن کے تابع فرمان رہتے ہو وہ وسائلِ رزق کے مالک نہیں۔ اس لئے تم فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ — رزق، خدا کے ہاں سے طلب کرو۔ وَاعْبُدُوْہُ۔ اس طرح محکومی صرف اسی کی باقی رہ جائے گی۔ وَاشْکُرُوْا لَہٗ (۲۹/۱۷) اور سپاس گزاری بھی اسی کی زیبا ہو گی۔ تم اپنے غلط نظامِ معیشت کی وجہ سے، دوسرے انسانوں کو ذرائع رزق کا مالک بنا دیتے ہو۔ پھر تم انکے محتاج و محکوم بھی ہو جاتے ہو اور رہینِ منت اور سپاس گزار بھی۔ اسطرح تم اپنے شرفِ انسانیت کو بیچکر اپنے بدن کو زندہ

رزقِ حلال

رکھتے ہو۔ قرآن، اس طرح سے حاصل کردہ رزق کو حلال و طیّب قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ فَکُلُوْا

مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۔ (۱۶/۱۱۴) اگر تم انسانوں کی محکومی کے چنگل سے آزاد ہو کر صرف خدا کی محکومی اختیار کرنا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ تم رزق صرف خدا کے ہاں سے حاصل کرو اور اس طرح شکر گزار بھی اسی کے بنو۔ یہی وہ رزق ہے جسے حلال و طیّب کہا جائے گا۔ یعنی مَا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۔ وہ رزق جو تمہیں خدا کے ہاں سے ملے۔ جس میں کسی انسان کی ملکیت کا دخل نہ ہو۔ یہی تھا وہ حلال و طیب رزق جس کے لئے حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے درخواست کی تھی اور جس کے حصول کے بعد جشنِ عید منایا گیا تھا۔ اور یہی تھا وہ رزق طیّب جو اُس رسولؐ آخرالزمان کے متشکل کردہ نظام کی وساطت سے حاصل ہوا تھا جس کی بعثتِ عظمیٰ کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔ (۷/۱۵۷) وہ نوعِ انسان کے لئے رزقِ طیّب کو حلال قرار دے گا اور رزقِ خبیث کو حرام ٹھہرائے گا اور اس طرح ان اغلال و سلاسل کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑے چلی آرہی تھی اور محتاجی و محکومی کی استخواں شکن سلوں کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ جو رزق نظامِ خداوندی کے تابع ملتا ہے اسے قرآن نے ہر جگہ "رزقِ کریم" کہہ کر کیوں تعبیر کیا ہے؟ اس لئے کہ رزق تو انسانوں کے خود ساختہ نظام کی رُو سے بھی مِل ہی جاتا ہے، لیکن وہ رزق ملتا ہے عزّت اور توقیر بیچکر۔ لیکن خدا کی طرف سے جو رزق ملتا ہے اس میں تکریم و احترامِ انسانیت بھی باقی رہتی ہے۔ اسی لئے یہ رزق، "رزقِ کریم" ہوتا ہے۔

انسانیت کُش نظام

دینِ خداوندی کا مقصد ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتیں پوری پوری نشوونما پا کر پروان چڑھ جائیں اور اس طرح وہ زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ یہ صلاحیتیں اسی صورت میں برومند ہو سکتی ہیں جب وہ سامانِ زیست کے لئے کسی انسان کا دست نگر نہ ہو۔ رزق کو اپنے ہاتھ میں لے لینے والی قوتیں اتنا ہی نہیں کرتیں کہ وہ لوگوں کو مفلس اور محتاج بنا دیتی ہیں۔ وہ ان کی صلاحیتوں کو اُبھرنے نہیں دیتیں۔ اس لئے کہ انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر ان کے تابع فرمان کام کرنے والوں کی صلاحیتیں نشوونما پا گئیں تو وہ سر اُٹھا کر چلنے کے قابل ہو جائیں گے اور انہیں حیوانات کی طرح دبا کر رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا، ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف حیوانی سطح پر زندہ رہیں، انسانی سطح پر کبھی نہ آسکیں۔ فرعون نے بنی اسرائیل کی انسانی زندگی کو ذبح کرنے کیلئے یہی حربہ استعمال کیا تھا۔ اس نے ان سے کہا تھا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۔ رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد، ان کے شرفِ انسانیت کو ذبح کر دینا مشکل نہیں تھا۔

اور یہ "فرعونِ مصر" تک مختص نہیں۔ دنیا کا ہر مستبد، صاحبِ اقتدار، یہی کچھ کرتا ہے۔

رسول کے بعد

قرآن بتاتا ہے (اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ) خدا کا رسول اس قسم کا انقلابی نظام متشکل کر کے چلا جاتا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد، مفاد پرست گروہ پھر سے سر نکالتا اور اس نظام کو الٹنے کی کوشش کرتا لیکن وہ تنہا ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے مذہبی پیشوائیت کو اپنے ساتھ ملاتا۔ یہ مذہبی پیشوا اس سلسلہ میں کیا ٹیکنیک اختیار کرتے، اسے قرآن کریم نے داستانِ بنی اسرائیل کے ضمن میں

بڑے بصیرت افروز انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کے معاشرہ کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ ان کے ہاں کے بڑے بڑے لوگ (جو دولت اور قوت کے مالک بن بیٹھے تھے) کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے اور جب انہیں دشمن پکڑ کر لے جاتا تو پھر چندہ اکٹھا کرتے تاکہ ان کا فدیہ دے کر انہیں دشمن کی قید سے آزاد کرا لیا جائے۔ وہ (انہیں اس طرح آزاد کرانے کو) بڑا ثواب کا کام سمجھتے۔ اگر مذہب پرستی کی سطحی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ کام واقعی بڑے ثواب کا نظر آئے گا ۔۔۔ خود قرآن کریم میں، اسیروں اور غلاموں کو آزاد کرانے کے کام کو بڑا مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ لیکن قرآن اس قسم کے نظر فریب سطحی جذبات سے بلند ہو کر حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ اس نے اس مقام پر کہا کہ اسطرح قیدیوں کا فدیہ دے کر انہیں چھڑانے کو ثواب کا کام سمجھنے والو! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ۔ ان لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرنا، ایسا سنگین جرم تھا جس کی تلافی اس قسم کے خیرات کے کاموں سے نہیں ہو سکتی۔ تمہیں جو ضابطۂ ہدایت دیا گیا تھا اس میں دو احکام تھے ۔۔۔ ایک یہ کہ اپنے ہاں کبھی ایسی صورت پیدا نہ کرو کہ تم میں سے کمزور لوگوں کو دشمن اچک کر لے جائیں اور دوسرے یہ کہ جن کمزور و ناتواں لوگوں کو مستبد قوتیں قیدی بنا لیں انہیں فدیہ دے کر چھڑا لیا کرو۔ یہ بڑا نیکی کا کام ہے۔ تم نے پہلے حکم کو نہ صرف پس پشت ڈال دیا بلکہ عمداً اس کی خلاف ورزی کی۔ اور دوسرے حکم کی تعمیل سے اپنے آپ کو بڑا نیکوکار سمجھنے لگ گئے۔ یہ روش غلط ہے۔ ضابطۂ خداوندی کو تمام لیا جائے گا تو اس کا نتیجہ خوشگوار مرتب ہو گا۔ لیکن اگر ایسا کیا جائے کہ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۔ اس کے ایک حصہ پر ایمان رکھا جائے اور دوسرے حصہ سے انکار کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نہیں برآمد ہو گا کہ تمہیں پچاس فی صد نمبر مل جائیں گے۔ بالکل نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ إِلٰى أَشَدِّ الْعَذَابِ (2/85) تم دنیاوی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہو گے اور قیامت کے دن بھی سخت ترین عذاب میں گرفتار۔

مذہبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے کہ نظامِ خداوندی کے اس حصہ کو جس سے مفاد پرستوں کی منفعت کوشیوں پر زد پڑتی ہو، پس پشت ڈال دیتی ہے اور ظواہر و رسوم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی اہمیت دیتی ہے کہ وہ عین دین بن جاتی ہیں۔ یہ ہے اُن کی وہ ٹیکنیک جس سے وہ قوم کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ وہ دینِ خداوندی پر عامل ہے۔

جس طرح سابقہ امتوں کے احبار و رہبان نے یہ چال چلی تھی۔ اسی طرح مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ ان کے ہاں بھی دین کی اصل و اساس کو پس پشت ڈال دیا گیا اور چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بڑھا چڑھا کر عین دین بنا دیا گیا۔ اب سارا زور ان جزئیات کی اہمیت پر دیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ دین کی اصل و بنیاد کو سامنے نہ آنے دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے کچھ روایات اور حکایات وضع کر لی جاتی ہیں جنہیں کبھی حضور نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور کبھی سلف صالحین کی طرف۔ چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

۱۔ قرآن کریم میں ہے:۔

دولت جمع کرنے کے خلاف

اے ایمان والو! یاد رکھو۔ ان علماء و مشائخ کی اکثریت ایسی ہے جو لوگوں کے مال کو ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں اور اس طرح انہیں خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔

(اور اسے بھی یاد رکھو کہ) جو لوگ دولت جمع کرتے ہیں اور اسے نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے (فی سبیل اللہ) کھلا نہیں رکھتے، ان کے لئے الم انگیز عذاب ہے۔ جس دن چاندی سونے کے ان سکّوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں، ان کے پہلوؤں اور ان کی پشتوں کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ اب اس اکتناز کا مزہ چکھو۔ (9/34-35)

ان آیات سے روزِ روشن کی طرح واضح ہے (اور قرآن میں اس مضمون کی یہی دو آیات نہیں۔ اس قسم کی متعدد آیات ہیں) کہ اسلام ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے جس میں دولت جمع نہیں کی جا سکتی۔ اب دیکھئے کہ مذہبی پیشوائیت نے اس کے خلاف کیا کیا۔ اس نے ایک روایت وضع کی جو غور سے سننے کے قابل ہے۔ وہ روایت یہ ہے:

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب (مندرجہ بالا) آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا۔ پس عمرؓ، رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جائے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔
(ابوداؤد۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ جلد اول۔ اردو ترجمہ صفحہ ۳۰۹)

آپ غور فرمائیے کہ اس ایک روایت نے کس طرح اسلام کے پورے کے پورے معاشی نظام کو الٹ کر رکھ دیا۔ اس روایت سے (جو ظاہر ہے کہ وضعی ہے) یہ ثابت ہوا کہ

۱۔ صحابہؓ سب کے سب سرمایہ دار تھے اور دولت جمع کرنا ان کا شعار تھا۔

۲۔ صحابہؓ کی (معاذ اللہ) کیفیت یہ تھی کہ خدا ایک حکم نازل کرتا ہے۔ اس کا رسول اس حکم کو ان تک پہنچاتا ہے۔ لیکن وہ حکم ان پر گراں گزرتا ہے۔ وہ اسے بدلوانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے (معاذ اللہ) ان سرمایہ پرستوں کا سب سے بڑا نمائندہ، حضرت عمرؓ، رسول اللہؐ کے پاس جاتا ہے۔

۳۔ رسول اللہؐ (معاذ اللہ) یہ فرماتے ہیں کہ تم خدا کے اس حکم کا کچھ خیال نہ کرو۔ تم جتنی جی چاہے دولت جمع کرتے جاؤ۔ بس اس میں سے اڑھائی فی صد زکوٰۃ نکال دیا کرو۔ باقی دولت سب پاک ہو جائے گی۔ (واضح رہے کہ اڑھائی فی صد زکوٰۃ کا حکم بھی قرآن میں کہیں نہیں)

آپ دیکھیں گے کہ اس اڑھائی فی صد زکوٰۃ کی اہمیت اور افضلیت پر اس قدر زور دیا جائے گا اور قرآن کی اس آیت کے متعلق (جس میں دولت جمع کرنے کے خلاف اس قدر تہدید آئی ہے) ایک لفظ بھی نہیں کہا جائے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس ٹیکنیک سے مسلمانوں کو کس طرح اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ دولت جمع کرنا کوئی جرم نہیں اور زکوٰۃ دے دینے سے سب مال پاک ہو جاتا ہے!

ایک مثال اور لیجئے۔ قرآن کریم کا نصب العین ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل تھا جس میں کوئی شخص کسی

عبوری دور کے احکام

دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ ہر فرد کو اس کی ضروریاتِ زندگی، بطور بنیادی حقِ انسانیت ملتی رہیں۔ آغازِ اسلام کے وقت معاشرہ جس حالت میں تھا اس نے اپنے پروگرام کو وہاں سے شروع کر کے، بتدریج اس کے منتہیٰ تک لے جانا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت معاشرہ میں طبقاتی تفاوت موجود تھا — کچھ لوگ امیر تھے، کچھ غریب اور محتاج — اس عبوری دور کے لئے قرآن نے دولت مندوں کو تلقین و تاکید کی کہ وہ صدقہ و خیرات سے محتاجوں کی مدد کریں۔ وراثت کے احکام بھی بنیادی طور پر اسی دور سے متعلق تھے۔ اس نظام کی آخری شکل یہ تھی جس کے متعلق قرآن میں ہے کہ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ..(2/219) "اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کی ضرورت کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری اپنی بنیادی ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب"۔ یہ نظام ایسا تھا جس میں ہر ایک کی ضروریات نظامِ مملکت کی طرف سے پوری ہوتی تھیں اور کسی کے پاس فالتو روپیہ رہتا ہی نہیں تھا۔

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ مذہبی پیشوائیت نے اس کے بعد کیا کیا؟ آپ دیکھیں گے کہ ان کی طرف سے صدقہ، خیرات فطرانہ کے لئے صبح و شام، دن رات، ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور قرآن کی وہ آیت جس میں حکم دیا گیا تھا کہ فالتو دولت کسی فرد کے پاس نہ رہنے پائے، کبھی سامنے نہیں لائی جاتی! جب اس پر زور دیجئے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ آیت، زکوٰۃ کے حکم سے منسوخ ہو چکی ہے (بحوالہ روایت حضرت ابن عباسؓ)

صدقہ و خیرات کا نتیجہ

اور آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ صدقہ اور خیرات کا عملی مفہوم کیا ہے؟ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ نظام معکوس ایسا قائم کیا جائے جس میں ایک طبقہ ہمیشہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم، فلہذا، دوسروں کا محتاج رہے۔ اور دوسرا طبقہ ایسا ہو جس کے پاس اپنی ضروریات سے زائد دولت ہو، یہ دوسرا طبقہ پہلے طبقہ کو خیرات دے کر ثواب کمائے۔ آپ سوچئے کہ اس دوسرے طبقہ کے پاس یہ فالتو روپیہ آیا کہاں سے ہے؟ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ روپیہ انہی لوگوں کی محنت کی کمائی ہے، جو معاشرہ میں محتاج بن چکے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو ان کی محنت کا پورا پورا ماحصل دے دیا جاتا تو نہ وہ محتاج ہوتے، نہ ان کے پاس فالتو روپیہ آتا۔ لیکن اس نظام نے کیا یہ کہ پہلے ایک طبقہ نے محنت کشوں کی کمائی کو غصب کیا اور اس طرح خود دولت مند بن گیا اور محنت کشوں کو محتاج بنا دیا۔ اور پھر ان محتاجوں کو خیرات کے چند ٹکے دے کر، جنت کا مالک بن بیٹھا۔ حالانکہ، قرآن کے الفاظ میں اُن لوگوں کو محتاج بنانا ایسا سنگین جرم ہے جس کی تلافی صدقہ اور خیرات سے ہو ہی نہیں سکتی۔ خیرات دینے والے کا نفس موٹا ہو جاتا ہے اور لینے والے کے شرفِ انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق۔

الصدقۃ نمیت القلب

خیرات سے انسان کا دل مردہ ہو جاتا ہے

قرآن کریم نے عبوری دور کے لئے (اسلامی نظام کی تشکیل کے زمانے تک بہ تقاضائے حالات) اسے روا رکھا تھا۔ اور اس میں بھی دینے والوں سے تاکید کر دی تھی کہ وہ اس جذبہ کے تحت دیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا (76/9)، ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے متمنی ہیں نہ شکریہ کے خواہاں۔ اور اس کی تاکید کر دی تھی کہ وہ محتاج کی

مدد کے بعد اسے احسان جتا کر اپنے صدقات کو باطل نہ بنا دیں۔ لیکن موجودہ مذہب نے صدقہ و خیرات کو مستقل کارِ ثواب قرار دے کر، قوم میں محتاجوں اور مفلسوں کے گروہ کی موجودگی کو مستقلاً ضروری قرار دے دیا۔ یعنی ایک ایسا نظام قائم کر دیا جس میں پہلے لوگوں کو مفلس اور محتاج بنایا جائے اور پھر انہیں خیرات دے کر ثوابِ دارین حاصل کیا جائے۔ کیا یہ وہی بنی اسرائیل کی روش نہیں جس سے وہ پہلے اپنے ہم نفسوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے تھے اور پھر فدیہ دے کر انہیں چھڑانے کو بہت بڑی نیکی کا کام تصور کرتے تھے؟ یاد رکھئے! جس نظامِ معاشرہ میں محتاج اور مفلس مستقلاً موجود رہیں اس سے زیادہ انسانیت سوز نظام کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

واضح رہے کہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، کوئی بچہ مفلس اور غریب پیدا نہیں ہوتا۔ باطل معاشرہ کسی کو مفلس اور غریب بنا دیتا ہے، کسی کو دولت مند اور امیر۔ یہ تفریق، انسانی معاشرہ کی پیدا کردہ ہے خدا کی نہیں۔ خدا کی طرف سے، برہمن۔ کشتری۔ ویش۔ شودر کی پیدائشی تفریق کا عقیدہ ہندوؤں کا ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت بڑے فخر سے اعلان کرتی ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے مفلس اور غریب بنا دیتا ہے، جسے چاہتا ہے امیر اور سرمایہ دار۔

نظامِ ربوٰا

ایک مثال اور سامنے لائیے۔ قرآنی نظریۂ معیشت کی رُو سے جو شخص کسی دوسرے کی محنت کے ماحصل کو کلیتہً یا جزوًا ہتیا کر لے جائے، وہ چور ہے، ڈاکو ہے، رہزن ہے، فریب کار ہے۔ قرآن ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں کوئی کسی کی محنت کو غصب کر کے نہیں لے جا سکتا۔ اس کی بالکل ضد ایک اور نظامِ معیشت ہے جس میں ایک شخص محض سرمایہ کے زور پر دوسروں کی محنت کو غصب کر لیتا ہے۔ وہ اسے ربوٰا کے نظام سے تعبیر کرتا ہے۔ آجکل ہمارے ہاں اسلامی نظامِ معیشت اور سود کے متعلق بڑے زور شور سے بحثیں جاری ہیں لیکن چونکہ مقصد یہ ہے کہ جو کچھ حرام، حلال ہوتا چلا آ رہا ہے، اسے کسی نہ کسی طرح اسلامی "ثابت کر دیا جائے اس لئے ہو یہ رہا ہے کہ۔ ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں۔ اگر، اپنی مصلحتوں کے برعکس جائز و ناجائز کا معیار، قرآن کریم کو قرار دے لیا جاتا تو صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ میں اس موضوع پر اس قدر کثرت سے لکھ چکا ہوں، اور لکھتا رہتا ہوں کہ اس وقت کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ قرآن نے اس سارے مسئلہ کو ایک بنیادی اصول کی رُو سے حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ معاوضہ محنت کا ہے۔ سرمایہ کا نہیں۔ اور نظامِ سرمایہ داری کی رُو سے معاوضہ سرمایہ کا ہوتا ہے۔ اسے ربوٰا کہا گیا ہے خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ نظام اس قدر قرآنی نظام کی ضد اور اس کا دشمن ہے کہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (2/279) انہیں خدا اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا الٹی میٹم دے دو۔ آپ نے غور کیا کہ اسلامی نظام کی رُو سے ربوٰا کیسا سنگین ترین جرم ہے۔ یہ بغاوت کے مرادف ہے۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے کیا کیا۔ وہ ربوٰا کو جائز تو قرار نہیں دے سکتی تھی لیکن اس نے ربوٰا کی تعریف (DEFINITION) ایسی کر دی جس میں دوسروں کی محنت کا غصب کر کے لے جانا شیرِ مادر کی طرح حلال و طیب قرار پا گیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر ایک شخص کسی کو کچھ روپیہ قرض دے تو اس اصل زر سے کچھ زیادہ وصول کرنا ربوٰا ہے۔ (اور اس جرم کے عواقب کے لئے بھی شرعی حیلے تراش لئے گئے) لیکن اگر کوئی شخص اسی روپے سے زمین کا قطعہ خرید کر اسے

کاشتکار کو دیدیتا ہے اور اس کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے پیدا کردہ فصل کا آدھا حصہ بٹ کرلے جاتا ہے، تو وہ ربوا نہیں مزارعت ہے۔ یا اس روپے کو کسی کاروباری کو دیدیتا ہے اور اس کے منافع میں شریک ہو جاتا ہے، تو یہ بھی ربٰو نہیں، مضاربت ہے۔ یعنی ربٰو کے لئے مختلف اصطلاحات استعمال کرنے سے حرام کو حلال قرار دیدیتے ہیں آجکل پاکستان میں یہ کاروبار بڑے زور شور سے چل رہا ہے اور اسے بلاسود بنکاری کہکر حلال وطیب قرار دیدیا جاتا ہے کاشتکار کی فصل یا کاروبار کرنے والوں کا منافع کہاں سے آتا ہے؟ یہ غریبوں کی محنت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سے جب محنت کش یا مزارعین غریب ہو جاتے ہیں، تو ان زمینداروں، کارخانہ داروں، اور اس قسم کے منافع خور سود اگروں سے اپیل کیجاتی ہے کہ ان غریبوں کو خدا واسطے کچھ دے کر، اپنا گھر جنت میں الاٹ کرالیں۔ یا حج کر کے اپنے سب گناہ بخشوا لیں۔ حالانکہ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ — ان محنت کشوں کی محنت کو غصب کر کے اپنی تجوریاں بھرتے چلے جانا ایسا سنگین جرم تھا جسے خدا اور رسولؐ کے خلاف بغاوت قرار دیا گیا تھا۔ غلط نظام کی عدالت، چور، ڈاکو، رہزن کو مجرم قرار دے کر مستوجب سزا ٹھہرائے گی لیکن اس قسم کے رہزنوں، اور قزاقوں کو کسی جرم کا مرتکب قرار نہیں دے گی۔ علمائے کرام، روپیہ کا سودی کاروبار کرنے والے کو جہنم کا کندہ بتائیں گے، لیکن ربٰو کی ان دوسری شکلوں میں، سر سے پاؤں تک ڈوبے رہنے والوں کو پکے اور سچے مومن قرار دیں گے —— ہے ناں یہ تُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کی بیّن مثال!

معاشرہ میں اس قسم کی صورتِ حالات کے پیدا ہونے کو روکنے کے لئے حضور نبی اکرمؐ نے وہ نسخہ تجویز فرمایا تھا جسے آپ نے تمثیلی انداز میں یوں بیان فرمایا تھا کہ

> کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصے میں رہے جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی پینے کے لئے اوپر آگئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ کہکر پانی پینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کرکے پانی لے لیں گے۔ اب اگر نیچے والوں کو پانی دے کر اس سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر انہیں پانی دے کر روک دیا جائے تو سب بچ جائینگے۔
>
> (ترمذی —— باب الفتن)

اس مقام پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جو مملکت قرآن کی رو سے قائم ہوتی ہے، وہ تمام افراد معاشرہ کو رزق (سامانِ زیست) بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتی ہیں۔ اس عظیم ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں رہیں اور افراد کے پاس زائد از ضرورت دولت جمع نہ ہونے پائے۔ اس نظام میں ہر فرد کو رزق "خدا کی طرف سے ملتا ہے"۔ وہ مائدۃ من السماء ہوتا ہے۔ اس میں نہ کوئی محتاج ہوتا ہے نہ محکوم۔ سب آزاد، اور مساوی انسان ہوتے ہیں اور صرف خدا کے قوانین (کتاب اللہ) کے پابند جس مملکت میں یہ نظام نہ ہو وہ مملکت اسلامی نہیں ہوتی۔ سیکولر ہوتی ہے۔

دین کے نظام میں، نماز، روزہ، حج وغیرہ وہ ذرائع تھے جن سے دین کا مقصود حاصل ہونا تھا۔ یعنی مساوات انسانیہ

اور احترامِ آدمیت کا مقصدِ عظیم۔ لیکن مذہب میں یہی چیزیں مقصود بالذات بن گئیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اب زور نماز، روزہ

ظواہر پرستی

وغیرہ کی ظاہر اور رسمی ہیئت کی اہمیت پر دیا جاتا ہے اور اس مقصد کو سامنے لایا ہی نہیں جاتا جس کے حصول کا یہ ذریعہ تھے۔ اس کے برعکس، قرآن کو دیکھئے تو وہ سارا زور مقصد پر دیتا ہے۔ غور سے سنیئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

> نیکی اور کشادگی کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ نیکی کی راہ اس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر، اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کے لئے حیاتِ آخرت پر، ملائکہ پر، ضابطۂ خداوندی پر۔ اور ان انبیاء پر جن کی وساطت سے یہ ضوابطِ خداوندی دنیا کو ملے۔ ان امور پر ایمان لائے اور پھر مال کی محبت کے باوجود اسے ان لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے جو اس کے قرب وجوار میں (یا رشتہ داروں میں) محتاج ہوں۔ جو معاشرہ میں تنہا رہ گئے ہوں۔ جن کا چلتا ہوا کاروبار رُک گیا ہو، یا اُن میں کام کرنے کی استطاعت نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جن کے پاس زادِ راہ نہ رہے، یا وہ جن کی کمائی اُن کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی نہ ہو۔ یا جو لوگ دوسروں کی محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوں۔ انہیں آزاد کرانے کے لئے اپنی فاضلہ دولت کو وقف کر دیں۔
> نیکی کی راہ ان لوگوں کی ہے ۔۔۔ الخ (2/177)

اس مقام پر میں ایک ثانیہ کے لئے رُک کر، ایک اہم نکتہ کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس آیۂ جلیلہ میں قرآنِ کریم

ایمان کی اہمیت

نے بتایا ہے کہ اصل نیکی کا کام یہ ہے کہ تم دوسروں کی مدد کے لئے اپنا مال کھلا رکھو۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اہم شرط بھی عائد کر دی ہے اور وہ یہ کہ تم دین کے ان اساسی عناصر پر ایمان لاؤ۔ سوال یہ ہے کہ ایمان کی کیا اہمیت ہے اور اس کے بغیر خود مال کا دینا بھی نیکی کا کام کیوں نہیں قرار پاتا۔ ایمان، درحقیقت وہ آئیڈیالوجی، وہ نظریہ، ہے جو زندگی کا صحیح تصور عطا، اور اس کا نصب العین متعین کرتا ہے۔ یہ آئیڈیالوجی ہی ہے جس کی بنیادوں پر اعمالِ انسانی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہی کسی کام کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار بنتی ہے۔ اسی کے مطابق انسانی اعمال اپنے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیئے کہ انسانی عمل کا جذبہ محرکہ ہی اُس کا ایمان (آئیڈیالوجی) ہوتا ہے۔ اور یہی اس کے لئے صحیح اقدارِ حیات متعین کرتا ہے۔ اقدار (VALUES) نہ ہوں تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب زندگی کو محض آب و گل کا کھیل سمجھا جائے اور موت کو اس کا انجام، تو انسانی زندگی، حیوانی سطح سے بلند نہیں ہوتی۔ یہ صحیح آئیڈیالوجی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے اشتراکیت جیسا معاشی نظام، جو سرمایہ داری کے مقابلہ میں کہیں انسانیت ساز ثابت ہو سکتا تھا، پروان نہیں چڑھ رہا، نہ کبھی پروان چڑھ سکے گا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن، ایمان (آئیڈیالوجی یا صحیح نظریۂ حیات) کو اپنے معاشی نظام کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو اقتدار یا نظام، نظریۂ حیات یا اقدار کے بجائے اشخاص سے وابستہ ہو، اس کی عمر شخص متعلقہ کی عمر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ نظریہ پر مبنی نظام، اشخاص کا محتاج نہیں ہوتا۔ جب تک وہ اقدار قائم رہیں، وہ نظام بھی قائم رہتا ہے۔ یہی وہ عظیم اصولی حقیقت تھی جس کی وضاحت کے لئے کھلے الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ ۔۔۔ وَمَا

مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ ۔ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ (۳/۱۴۴) ۔ یعنی، اور تو اور، خود محمدؐ بھی بجز این نیست کہ اللہ کے ایک پیغمبر ہیں۔ ان سے پہلے بھی خدا کے پیغامبر آتے رہے اور اپنی عمر پوری کرنے کے بعد دنیا سے چلے جاتے رہے ۔ تو کیا اگر کل کو یہ بھی قتل کر دیئے جائیں، یا وفات پا جائیں، تو تم یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام صرف ان کی ذات سے وابستہ تھا، پھر اپنے نظامِ کہن کی طرف لوٹ جاؤ گے؟
اور اس کی تشریح خلیفۂ رسول، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس طرح فرمائی کہ جب رسول اللہؐ کی وفات پر امت میں کہرام مچ گیا تو آپ نے حاضرین کو مخاطب کیا اور ان سے کہا کہ اس بات کو غور سے سن لو کہ جس شخص نے محمدؐ کی عبودیت اختیار کر رکھی تھی وہ سمجھ لے کہ اس کا معبود مر گیا ہے۔ لیکن جو خدا کا عبد تھا اسے اطمینان رکھنا چاہیئے کہ اس کا معبود حیؔ و قیوم ہے ۔ وہ کبھی نہیں مرے گا۔ اس اعلانِ عظیم نے دین کے نظام کو شخصیتوں سے بلند لے جا کر اقدار و نظریات کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ یہ نظام اُس وقت بگڑا جب مسلمانوں نے قرآنی نظریۂ زندگی کو چھوڑ کر غیر قرآنی نظریات و تصورات کو اختیار کر لیا، اور سارا زور شخصیتوں پر دینے لگ گئے یا شخصیتیں سارا زور اپنے آپ کو منوانے پر صرف کرنے لگ گئیں ۔

تیسری بات یہ کہ قرآن کریم نے آئیڈیالوجی کی بُنیاد پر قومیت کی تشکیل کا ارفع و اعلیٰ نظریہ پیش کیا تھا اور اس نظریہ کے مطابق حضور نبی اکرمؐ نے ایک ایسی اُمّت کی تشکیل فرمائی تھی جو رنگ، نسل، زبان، وطن کی نسبتوں سے بلند ہو کر، ایک عالمگیر وحدت بن گئی تھی۔ اس باب میں، میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آئیڈیالوجی کی وحدت کی بنا پر وحدتِ اُمّت اسی صورت میں وجود پذیر ہو سکتی ہے جب اُس آئیڈیالوجی کی نمود ہماری عملی زندگی میں ہو لیکن اگر ایسا نہ ہو اور آئیڈیالوجی محض الفاظ کا مجموعہ بن کر رہ جائے جسے رسمی طور پر دُہرا لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے وحدتِ اُمت کبھی ظہور میں نہیں آ سکتی، ایسا کرنے والے افراد کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ آپ سوچئے کہ اس وقت دنیا میں ساٹھ ستر کروڑ (بلکہ ایک ارب کے قریب) مسلمان بستے ہیں جو زبانی اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا خدا ایک، رسول ایک، قبلہ ایک، کلمہ ایک ہے ۔ اس اقرار کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم لاشعوری طور پر اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ سب مسلمان ——— نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر ——— ایک قوم کے افراد ہیں ۔ لیکن عملاً ہماری صورت یہ ہے کہ ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان تو ایک طرف، ایک ملک کے مسلمان باشندے بھی ایک قوم کے افراد نہیں ۔ اس خود فریبی کا سخت مضرت رساں پہلو یہ ہے کہ، ہم آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ایک قوم تو بنتے نہیں، اور دنیا نے آئیڈیالوجی سے الگ ہٹ کر، تشکیلِ قومیت کے جو عناصر تجویز کئے ہیں، ——— مثلاً نسل، یا وطن کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل ۔ انہیں، نہ صرف یہ کہ ہم اپناتے نہیں بلکہ انہیں خلافِ اسلام قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں ۔ بالفاظِ دیگر، اسلام کو ہم اپنی عملی زندگی میں رائج نہیں کرتے اور کفر کو ہم اپناتے نہیں ۔ یعنی ہم نہ آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ایک قوم بنتے ہیں (جو قرآن کا تقاضا تھا) اور نہ ہی باقی اقوامِ عالم کے معیاروں کے مطابق ایک قوم بنتے ہیں ۔ یعنی ہم نہ تو اسلام کے انسانیت ساز نتائج سے متمتع ہوتے ہیں، نہ کفر کے دنیاوی مفاد سے ۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دنیا میں مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں، انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ قومی اور اجتماعی نہیں ۔ اس کا مشاہدہ آپ خود پاکستان میں کر سکتے ہیں ۔ ہم اب تک قوم نہیں بن سکے، انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ ہم میں سے ہر

شخص کے سامنے اپنا اپنا انفرادی مفاد ہے۔ اجتماعی مفاد کسی کے پیش نظر نہیں۔ یہ ہوتا ہے حشر اس قوم کا جو آئیڈیالوجی کے الفاظ کو دُہرا کر اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو جائے کہ یہ اپنے نتائج عملاً مرتب کرے گی۔

اب پھر اُسی مقام کی طرف آئیے جہاں سے میں نے اس سلسلے کو چھوڑا تھا۔ میں کہہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ نیکی اور سعادت کی راہ، ارکانِ اسلامی کی رسمی پابندی نہیں۔ نیکی اور رشد کی راہ اس کی جو دین کے مقصود و منتہیٰ پر نگاہ رکھے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے دوسرے مقام پر کہا ہے

"کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینے اور مسجد الحرام کی آباد کاری کے مختلف کام سرانجام دے دینے سے انسان اس شخص کے برابر ہو جاتا ہے جو خدا اور حیاتِ آخرت پر ایمان رکھے اور خدا کی راہ میں مسلسل جدوجہد کرے۔ (تم اپنے خود تراشیدہ تصوّرِ مذہب کی رُو سے کچھ ہی سمجھ لو) میزانِ خداوندی میں یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (جو ایسا سمجھتے ہیں وہ ظلم کرتے ہیں) اور خدا کا قانونِ مشیت، یہ ہے کہ ظالمین پر فلاح و سعادت کی راہ کبھی نہیں کھلتی۔"

"یاد رکھو! جو لوگ خدا کے متعین کردہ نصب العین (آئیڈیالوجی) پر یقین محکم رکھتے ہیں اور نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کے لئے اپنی جان اور مال سے مسلسل جدوجہد کرتے ہیں اور اس بلند مقصد کے حصول کے لئے جو کچھ چھوڑنا پڑے، اسے بلا تامّل و توقف چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے مدارج معیارِ خداوندی کے مطابق بہت بلند ہیں اور یہی لوگ درحقیقت کامیاب و فائز المرام ہیں۔" ($\frac{9}{19-20}$)

مساوات کے نمونے

یہی وہ نظام تھا جس میں، کوئی فردِ معاشرہ تو ایک طرف، (حضرت عمرؓ کے ارشاد کے مطابق) اگر کوئی کتا بھی بھوک سے مر جاتا تو معاشرہ کا سربراہ اپنے آپ کو مجرم تصوّر کرتا تھا۔ اور یہی تھا وہ نظام جس میں مملکت کا سربراہ اس وقت تک گیہوں کی روٹی نہیں کھاتا تھا جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کا مقصد مساواتِ انسانیہ تھا۔ آپ ہمارے واعظوں کو جھوم جھوم کر بیان کرتے دیکھیں گے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ کا کوئی کپڑا کبھی تہ کر کے نہیں رکھا۔ اور حضرت عمرؓ منبر پر کھڑے تھے تو دیکھا گیا کہ ان کے تہبند میں دس بارہ پیوند تھے۔ وہ ان واقعات کو بیان کر کے تاثر یہ دیں گے کہ یہ ان حضرات کی ذاتی اور انفرادی خوبیاں تھیں وہ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ یہ فطری نتیجہ تھا اس نظام کا جس کی بنیاد انسانی مساوات پر تھی۔ وہ نظام جس میں تمام افرادِ معاشرہ کا معیارِ زیست ایک جیسا تھا جس میں جو ایک کو میسّر آتا تھا وہی سب کو مہیا ہوتا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے، میں اس مساوات کی تھوڑی سی تشریح ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ مساوات ایسی نہیں تھی

مساوات سے مقصود

جیسے جیل خانہ میں قیدیوں کو ایک جیسی وردی پہننے کو اور ایک جیسی روٹی کھانے کو ملتی ہے (ضمناً، اب تو جیل خانوں میں بھی یہ مساوات باقی نہیں رہی۔ ایک امیر آدمی، اور غریب آدمی، ایک ہی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں اور عدالت سے انہیں ایک ہی جیسی سزا ملتی ہے لیکن جیل خانہ میں امیر آدمی کو اسے کلاس دے دی جاتی ہے اور غریب آدمی کو سی کلاس۔ اور دیگر آسائشوں کے علاوہ

۔یہی سی کلاس قیدی، اس اسے کلاس والے کو بطور خدمت گار عطا کر دیا جاتا ہے ۔یعنی دونوں ایک جیسے مجرم ہیں لیکن اُن میں سے وہاں بھی ایک آقا ہے اور دوسرا اس کا غلام) بہرحال، میں یہ کہہ رہا تھا کہ مساواتِ انسانیہ سے مراد جیل خانہ کی سی مساوات نہیں اس سے مراد ایسی مساوات ہے جو ایک شریف گھرانے کے افراد میں ہوتی ہے ۔اس میں، گھر کی آمدنی میں سے ہر ایک فرد خاندان کو اس کی ضرورت کے بقدر ملتا ہے ۔ان میں فرق ضروریات کا ہوتا ہے ۔معیارِ زندگی کا نہیں ۔یہی کیفیت قرآنی نظام میں افرادِ معاشرہ کی ہوتی ہے ۔اس میں قوم کے سارے بچّوں کو ابنائے ملّت سمجھا جاتا اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں انتظام کیا جاتا ہے ۔اس کے بعد، ہر ایک کی صلاحیتوں کے مطابق تقسیمِ کار کر دی جاتی ہے ۔ہر فرد اُس کام کو نہایت محنت اور دیانت سے سرانجام دیتا ہے جو اس کے سپرد کیا جاتا ہے، اور نظامِ معاشرہ اُس کی اور اس کے بال بچّوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کئے چلا جاتا ہے ۔اس میں معیارِ زیست تو سب کا ایک ہوتا ہے، لیکن انفرادی ذوق اور پسند کا میدان وسیع ہوتا ہے ــــ یعنی انسان اور انسان سب برابر (اس میں مرد اور عورت کی بھی کوئی تخصیص و تمیز نہیں) معاشرہ میں مدارج ہر ایک کے جوہرِ ذاتی، بلندیٔ سیرت و کردار اور حسنِ کارکردگی کے مطابق ۔اور ضروریاتِ زندگی کے مہیا کئے جانے میں انفرادی حسنِ ذوق کے مطابق انتخاب کی گنجائش ۔جوں جوں قومی دولت بڑھتی جائے، معاشرہ کا معیارِ زیست بلند ہوتا چلا جائے ۔یہ ہے نقشہ قرآنی نظامِ معاشرہ میں مساواتِ انسانیہ کا ۔یہی تھی وہ مساوات جس کے لئے اس نظام کے ارکان ــــ صلوٰۃ، صیام، حج، زکوٰۃ وغیرہ ــــ کا تعیّن کیا گیا تھا ۔ہمارا واعظ اب بھی مساوات کا ذکر کرتا ہے، اور بڑے فخر کے ساتھ کرتا ہے ۔لیکن اب اس مساوات کی صرف رسم باقی ہے ۔اس کی روح اور حقیقت غائب ہے ۔اقبالؒ نے کہا تھا کہ اذان کی آواز پر نماز میں:۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا، اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ہماری مسجدوں میں "محمود و ایاز" ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں لیکن ان میں یہ مساوات صرف مسجد کی صف تک محدود ہوتی ہے ۔مسجد سے باہر نکلتے ہی ــــ بلکہ اس صف سے اٹھنے کے بعد، صحنِ مسجد میں ہی ــــ محمود، محمود ہوتا ہے اور ایاز، ایاز ــــ وہ محمود کے جوتے اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے، نہایت مؤدب انداز سے چلتا ہے ۔عرفات کے میدان میں بھی بے شک امیر و غریب سب ایک ہی سلی چادر میں ملبوس کھڑے ہوتے ہیں لیکن وہاں سے لوٹنے کے بعد، امیر حاجی جس ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں رات بسر کرتا ہے، غریب بچارا، اس کا تصوّر مرنے کے بعد کی جنّت میں ہی کر سکتا ہے اس زندگی میں کبھی نہیں کر سکتا ۔

ہمارا واعظ اب بھی بتاتا ہے کہ دیکھئے ۔روزہ میں غریب اور امیر ایک ہی طرح سارا دن بھوکے اور پیاسے رہتے ہیں ۔یہ اسلامی مساوات ہے ۔لیکن وہ اس فرق کو ہی سامنے نہیں لاتا جو ان دونوں کی سحری اور افطار میں ہوتا ہے ۔امیر کے بیٹے کی پہلی افطاری کے جشن میں جو کچھ ایک شام کو صرف ہو جاتا ہے وہ اس غریب کی سال بھر کی آمدنی سے بھی زیادہ ہوتا ہے ۔

اس رسمی اور روایتی مساوات کا بھانڈا بالآخر، عیدگاہ میں جا کر پھوٹتا ہے ۔جس انداز سے عید کے چاند کا

انتظار ہوتا ہے اور جس ذوق و شوق اور جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا جاتا ہے، اس سے یوں نظر آتا ہے گویا ساری قوم ہمہ تن جشنِ مسرت ہے۔ لیکن صبح جب عید کے اجتماع کے لئے جائیے، تو دور ہی سے یہ آوازیں فضا میں تھرتھری پیدا کرتی دکھائی دیتی ہیں کہ "بابا! خدا کے نام پر ـــــ چار پیسے دیتے جائیے۔ میرے بچے بھوکے ہیں"۔ "میاں صاحب! اللہ کے واسطے میری جھولی میں کچھ ڈالتے جائیے۔ میں ایک لاوارث بیوہ ہوں جس کے بچوں کے تن پر سردی گرمی سے بچنے کے لئے کپڑا تک نہیں"۔ دوسری طرف سے یہ دلگداز اور جگر خراش صدا جو سوہانِ روح بنتی ہے کہ "بابا! میں تین مہینے سے بیمار اور لاچار ہوں۔ میری دوائی کے لئے کچھ دیتے جائیے۔ خدا تمہاری نماز، روزے قبول کرے گا"۔ یہ زہرہ گداز اور دل سوز آوازیں سنتے سنتے آپ عید گاہ میں داخل ہوں، تو وہاں اس سے بھی زیادہ جگر پاش منظر دکھائی دے گا۔ فاقوں کے مارے ہوئے زرد چہرے۔ افلاس و غربت کے جھنجھوڑے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے، افسردہ پیشانیاں۔ پژمردہ آنکھیں۔ پوری فضا پر عبرت انگیز مایوسیوں کی ہولناکی مسلط ـــــ اس سے پہلے، پھر بھی ایسا ہوتا تھا کہ ہر شخص کو بالعموم اور بچوں کو بالخصوص کم از کم سال میں ایک بار، عید کے موقعہ پر، نئے کپڑے ضرور مل جاتے تھے۔ اب آپ عید گاہ کے اجتماع پر نگاہ ڈالئے۔ شاید ایک فی صد نمازی بھی ایسے نظر نہ آئیں گے جو نئے کپڑوں میں ملبوس ہوں ـــــ باقی سب نے انہی پرانے کپڑوں کو دھو کر تن ڈھانپ رکھا ہوگا ـــــ اور ان میں بھی اکثر ایسے جن کے کپڑوں کے چیتھڑے اُڑے ہوئے ہوں ـــــ ادھر چندہ مانگنے والے صفوں میں جھولیاں لئے پھر رہے ہیں۔ اُدھر امام صاحب صدقۂ فطر کے فضائل بیان فرما رہے ہیں ـــــ اس سے وہ سرمایہ داروں کو جنت کی بشارتیں دیتے ہیں اور غریبوں اور محتاجوں کو تقدیرِ خداوندی پر شاکر رہنے کی تلقین فرماتے ہیں اور اس طرح اُن کی نگاہ کبھی اُس باطل نظام کی طرف اُٹھنے نہیں دیتے جس کی پیدا کردہ ناہمواریوں کا نام تقدیرِ خداوندی رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ ہے اس قوم کا جشنِ عید، جسے جشن کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یاد رکھیئے! جس جشن میں قوم کا ایک فرد بھی حقیقی مسرت سے محروم رہ جائے، وہ جشن، جشن نہیں۔ قوم کی بدنصیبی کا ماتم ہے۔ عید اسی قوم کی ہے جسے رزق (حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ میں) خدا کے آسمانی نظام کی رُو سے ملتا ہے اور جس میں ہر فردِ معاشرہ، بلامنتِ غیرے، بطورِ استحقاق، برابر کا شریک ہوتا ہے۔ جس قوم کو انسانوں کے خودساختہ نظام کے تابع رزق ملے ـــــ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ چند افراد تو قارون کے خزانے کے مالک ہوں اور باقی افرادِ معاشرہ روٹی کے ٹکڑے کے لئے بھی ترس رہے ہوں۔ اور اگر انہیں وہ ٹکڑہ ملے بھی تو شرف و تکریمِ انسانیت بیچ کر ملے ـــــ اس قوم کی عید، ایک مقدس فریب سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی وہ عید ہے جس کا ہلال، اس قوم کی ہنسی اڑاتا ہے، اور دنیا کی قومیں جس کی فریب خوردگی کا تماشہ دیکھنے کے لئے دُور دُور سے آتی ہیں۔

اجتماعِ عید کا منظر

قرآن کریم نے روزوں کا مقصد یہ بتایا تھا کہ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (۲/۱۸۵)۔ تاکہ تم اس قابل ہو جاؤ کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ اس کے نظام کو انسانوں کے خودساختہ ہر نظام پر غالب کر سکو۔ اقتدار صرف خدا (یعنی کتاب اللہ) کے لئے مخصوص ہو جائے اور اس میں کوئی انسان شریک نہ ہو۔ روزے سب سے پہلے ۲ سنہ ہجری میں فرض ہوئے اور جماعت مومنین نے ابھی سترہ دن کے روزے رکھے

تھے کہ انہوں نے بدر کے میدان میں لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ کا عملی مظاہرہ کر کے دکھا دیا۔ یہ مطلب تھا تَکبیر کا دین کے نظام میں۔ اب ہمارا امام یہ بتاتا ہے کہ نماز عید میں چھ زائد تکبیریں کہہ دینے سے یہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے دیکھئے! بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ جب دین مذہب میں تبدیل ہو جائے تو اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے ——— دین میں اللہ اکبر کے اعلان کے معنی تھے خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کا اعلان۔ مذہب میں پہنچکر اس کا مفہوم نماز عید کی زائد چھ تکبیریں رہ گیا ——— مذہب میں چھ چھوڑ، چھ سو مرتبہ بھی اللہ اکبر کہیئے تو اس کا، دو لفظ دہرانے سے زیادہ نہ کوئی مفہوم ہوتا ہے، نہ کوئی نتیجہ۔ لیکن دین کے نظام میں اللہ اکبر کے اعلان کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ خدا کے قانون سے بالا کوئی قانون نہیں اور آسمانی نظام سے برتر کوئی نظام نہیں۔ کائنات میں اقتدارِ اعلیٰ صرف خدائی نظام کو حاصل ہے۔ اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں میں اکبر و اصغر کی کوئی تفریق نہیں اس لئے کہ نہ کوئی کسی کا محتاج ہے نہ محکوم ——— سوچئے کہ ان تکبیروں اور نماز عید کی موجودہ تکبیروں میں کس قدر فرق ہے اقبالؔ کے الفاظ میں!

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

جشنِ عید شاہیں بچوں کا حق ہوتا ہے ——— مردار خور کرگسوں کا نہیں!

وَالسَّلام!